تجھ کو کتنوں کا لہو چاہیے اے ارضِ وطن

(کلامِ فیض میں جنگ سے نفرت)

محمد عثمان ☆

Abstract:

War is a continuous human behaviour which has been hated or opposed by all sensitive authors or poets.Faiz has also been against war throughout his life. In 20th centuary,war was not only a fight, it was a catastrophe for thousands of houeholds,human lives and propertiesel .Fall of Dhaka, Martial law, war in Palestine,Arab-Israel war were a few of the incidents which kept his heart and pen in a continuous plight.He not only prayed for the end of war but also showed solidarity with the opressed and disgust for the opressors.Among Progressive writers, he was the one who wrote and struggled against war as well.

جنگ انسانی تاریخ میں واقعہ ہی نہیں ایک رویہ بھی ہے۔بطور واقعہ اس کا اختتام ہو جاتا ہے لیکن بطور رویہ اس کا تسلسل کبھی ختم نہیں ہوتا بلکہ ہر دفعہ اس کا ایک نیا اور بھیانک روپ سامنے آتا ہے۔اگر تاریخ کا مطالعہ کریں تو دنیا کا کوئی بھی خطہ ایسا نہیں ہے جو حالتِ جنگ میں نہ رہا ہو۔ہر دور میں مختلف قوموں نے مختلف وجوہات کی بنا پر آپس میں جنگیں لڑیں جن کا نتیجہ خون ریزی اور تباہی کے سوا کچھ نہ نکلا۔ہر دور کا ادب تخلیق کرنے والے لوگوں نے اپنے دور میں ہونے والے عوام پر ظلم و جبر اور جنگ کے نتیجہ میں ہونے والی ہولناک تباہی کو لفظوں کا لباس پہنایا ہے۔قتل و غارت کا سلسلہ میرؔ اور غالبؔ جیسے بڑے شعرا کے زمانوں میں بھی جاری رہا ہے جنہوں نے اس کا اظہار کچھ یوں کیا ہے:

اب خرابہ ہوا جہاں آباد
ورنہ اک اک قدم پہ یاں گھر تھا (۱)

ہے موجزن اک قلزمِ خوں، کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے (۲)

☆ لیکچرار، شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج فیصل آباد

بیسویں صدی بھی جنگوں کی ہولناکیوں سے بھری پڑی ہے اور اسی صدی میں فیض احمد فیضؔ جیسا حساس دل شاعر بھی پیدا ہوتا ہے۔فیض ایک ایسی تحریک سے وابستہ رہے جو دو عظیم جنگوں کے درمیان شروع ہوئی اس تحریک کا نام انجمن ترقی پسند تحریک ہے جس کے معتقفین نے امن کی بحالی، روشن مستقبل اور عوام کے مسائل پر بات کی۔اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ ادب کو خواص کے اجارے سے نکال کر عوام سے قریب تر لایا جائے اور جو ادب لکھا جائے اس کا عوامی سطح پر کوئی نہ کوئی مقصد ہو۔عقیل احمد صدیقی لکھتے ہیں:

> ''تحریک نے اپنے منشور میں ''مقصدیت'' پر زور دیا تھا اور اُردو کے ادیبوں کو سماجی ذمہ داری قبول کرنے کا مشورہ دیا تھا۔اس تصور میں ہر مکتب خیال کے ادیبوں اور دانشوروں کے لیے کشش تھی۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک کو بہت سے اہم ادیبوں اور سیاست دانوں کی ہمنوائی حاصل ہوئی۔''(۳)

فیض احمد فیض ترقی پسند تحریک کے انہی ہمنواؤں میں سے ایک ہیں۔فیض عوام کا دکھ درد دل کی گہرائی سے محسوس کرتے اور اس کا اظہار اپنے قلم سے کرتے تھے۔فیض کے ترقی پسند ہونے کے بارے میں فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

> ''جنگ، قحط اور سیاسی وعمرانی ابتری میں گھرے ہوئے، ''یادِ ماضی سے شمیں، دہشتِ فردا سے نڈھال'' نوجوانوں کے لیے اشتراکیت کا نعرہ جادو کا حکم رکھتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ اقبال نے طریق کوہ کن کے پرویزی حیلوں کو بے نقاب کرنا شروع کیا تو رجعت پسند کہلائے مگر فیض نے مساواتِ شکم کا درس دیا تو ترقی پسند ٹھہرے۔''(۴)

فیض کا تعلق بیسویں صدی سے ہے اور بیسویں صدی جنگوں کی ہولناکیوں، عروج و زوال اور فتح و شکست کے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ایسے حالات جن میں امن کا فقدان ہو، معاشرے میں ہر گام پر مقتل گاہیں ہوں، بازار میں مزدور کا گوشت بک رہا ہو، شاہراہوں پر غریبوں کا لہو بہہ رہا ہو، دن رات سخت محنت کرنے والے غریب کسانوں سے اُن کی روٹی چھین لی جاتی ہو، ظلم وستم کے نتیجے میں ہزاروں جوانیوں کو موت نے نگل لیا ہو۔ہر طرف بے یقینی اور خوف ہو، ایک نہایت حساس دل فیض عوام کا دکھ درد محسوس کرتے ہیں اور جنگ کے خلاف شدید نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔

۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران میں ذوالفقار علی بھٹو سیاست میں سرگرم تھے۔فیض احمد فیض بھی سیاست سے وابستہ تھے۔غیر ملکی دوروں میں بھی فیض ذوالفقار علی بھٹو کے ہمراہ ہوتے تھے۔فیض جیسے حساس دل شاعر اپنے ملک میں جنگ کی شدید مخالفت کرتے اور امن کی بحالی کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ جنگ تباہی ہے، بربادی ہے اور اس سے ہزاروں گھر اُجڑ جاتے ہیں اور ہزاروں جانیں موت کے کنویں میں دھکیل دی جاتی ہیں اس لیے فیض جنگ سے شدید نفرت کرتے ہیں اور جنگ کے دوران میں بہنے والے خون کی پُرزور مذمت کرتے ہیں۔فیض ہر طرف خون کا بازار گرم دیکھ کر بہت مایوس ہوتے ہیں اور لکھتے ہیں:

میں نے گرد آلود آنکھوں کو لہو سے دھو لیا
اور اب ہر شکل و صورت
عالمِ موجود کی ہر ایک شے
میری آنکھوں کے لہو سے اس طرح ہم رنگ ہے
خورشید کا کندن لہو
مہتاب کی چاندنی لہو
صبحوں کا ہنسنا بھی لہو
راتوں کا رونا بھی لہو
ہر شجر مینا رخوں، ہر پھول خونیں دیدہ ہے
ہر نظر اک تا رخوں، ہر عکس خوں مالیدہ ہے(۵)

فیضؔ جنگ کے خاتمے اور امن کی بحالی کے لیے دعا گو ہیں:

کہیں سے لا کوئی سیلابِ اشک
آبِ وضو
جس میں دُھل جائیں تو شاید دُھل جائیں
میری آنکھوں، میری گرد آلود آنکھوں کا لہو(۶)

لیکن فیض کی دعائیں رنگ نہ لاسکیں اور جنگ کے نتیجے میں پاکستان دو حصوں میں تقسیم ہوگیا جس کا فیض کو بہت صدمہ پہنچا اور وہ اپنوں کی جدائی پر آنسو بہاتے رہے۔ سبطِ حسن لکھتے ہیں:

''مگر جن کے سر پر خون سوار تھا اُن کی آنکھوں میں محبت اور ندامت کے آنسو کہاں سے آتے، بالآخر 'شمشیر شناسائی' دل میں ٹوٹی اور 'یارا غیار ہو گئے'۔ مشرقی بنگال بنگلہ دیش بن گیا مگر فیض صاحب اُس کی یاد میں آنسو بہاتے رہے اور اپنے نغمۂ بے صدا کو درد کی دھن میں گاتے رہے۔''(۷)

فیض اپنی نظم ''پاؤں سے لہو کو دھو ڈالو'' میں اسی رنج و الم کا اظہار کرتے ہیں:

ہم کیا کرتے کس راہ چلتے
ہر راہ میں کانٹے بکھرے تھے
اُن رشتوں کے جو چھوٹ گئے
اُن صدیوں کے یارانوں کے
جو اک اک کر کے ٹوٹ گئے
جس راہ چلے، جس سمت گئے

یوں پاؤں لہولہان ہوئے
سب دیکھنے والے کہتے تھے
یہ کیسی ریت رچائی ہے
یہ مہندی کیوں لگائی ہے (۸)

فیضؔ چاہتے تھے کہ پاکستان دوبارہ سے ایک ہو جائے۔ دونوں طرف کی عوام میں رنجشیں ختم ہو جائیں اور دوبارہ محبتوں کے رشتے قائم ہو جائیں لیکن فیض نے جب بنگلہ دیش کا دورہ کیا تو اُن کو وہاں کا ماحول دیکھ کر شدید دکھ پہنچا۔ ڈاکٹر صغریٰ صدف لکھتی ہیں:

''فیض کو دورۂ بنگلہ دیش کے دوران وہاں کے عوام کا ردعمل اور بیگانگی کا رویہ دیکھ کر شدید رنج ہوا۔ صدیوں کے ناتے بیگانگی میں تبدیل ہو چکے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ نفرتیں پھر محبتوں میں تبدیل ہو جائیں مگر تہہ بہ تہہ دلوں میں کدورتیں بھری تھیں۔ وہ اتنی جلدی ختم ہونا مشکل تھا۔''(۹)

اس بارے میں سبطِ حسن لکھتے ہیں:

''بھٹو صاحب خیر سگالی کے دورے پر ڈھاکے گئے اور فیض صاحب کو بھی لیتے گئے لیکن بات نہ بنی۔ واپس آئے تو بہت آزردہ تھے۔ کہنے لگے کہ ہم تو بڑے شوق سے گئے تھے کہ سب یار آشناؤں سے ملاقات ہوگی مگر سارا وقت ہوٹل میں بند رہے۔ ایک آدھ دوستوں سے ملنا ہوا وہ بھی بڑی مشکلوں سے۔''(۱۰)

ڈھاکہ سے واپس آئے تو فیض نے نہایت آزردگی کے عالم میں دردانگیز نظم ''ڈھاکے سے واپسی پر'' لکھی۔

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی مدارتوں کے بعد
کب نظر میں آئے گی سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد
دل تو چاہا پر شکستِ دل نے مہلت ہی نہ دی
کچھ گلے شکوے بھی کر لیتے مناجاتوں کے بعد (۱۱)

فیض کا اتنے دکھ بھرے انداز میں اظہارِ بیان فیض کو دوسرے شعرا سے ممتاز کرتا ہے۔ قاسم یعقوب فیض صاحب کی اسی نظم ''ڈھاکہ سے واپسی پر'' سے متاثر ہو کر اُن کی ممتاز حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''دل چاہ رہا تھا مگر ''شکستِ دل'' نے مہلت نہ دی کہ کچھ گلے شکوے ہی کر لیں۔ فیض کا یہی انداز اُسے دوسرے شعرا سے ممتاز کرتا ہے۔ کیا خوبصورت عکاسی ہے اُس کرب کی، اُس دکھ بھرا ذیت کی جو لحظہ لحظہ خون میں پگھلتی جا رہی تھی، جس کا کوئی چارہ نہیں۔''(۱۲)

فیض اس روئے زمین پر ہمیشہ امن دیکھنا چاہتے ہیں اور دنیا کو امن کا گہوارہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اُن کے اپنے اُن کا ساتھ نہیں دیتے، اپنے ہی ملک کے لوگ آمریت کو جمہوریت کا لبادہ پہنا کر امن اور انصاف کی دھجیاں بکھیر دیتے ہیں۔ ملک کے اندر مارشل لاء کے ادوار میں قانون کا مذاق اُڑایا جاتا رہا، مخالفین کو سزائیں دی جاتی رہیں، عام لوگوں کے لیے انصاف کی فراہمی معطل کر دی جاتی۔ تو ایسے حالات میں فیض کی امن قائم کرنے کی کوششیں ادھوری رہ جاتیں۔

ہر قوم سمجھتی ہے کہ اس دنیا میں امن ہونا چاہیے۔ مگر کوئی بھی قوم مستقل بنیادوں پر امن قائم کرنے کے لیے کوئی خاص انتظام نہیں کر سکی۔ ہمارے آباؤ اجداد نے پاکستان اس لیے حاصل کیا تھا کہ یہاں مسلمان بالکل آزاد ہوں، امن قائم ہو اور ہر کسی کو انصاف ملے۔ اس کے لیے بے شمار قربانیاں بھی دینا پڑیں۔ ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی اور مسلمانوں کو جانی اور مالی طور پر بہت نقصان پہنچایا۔ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے چند ہی سالوں بعد ۱۹۶۵ء میں محبِّ وطن پاکستانیوں کو اپنے ملک کی حفاظت کے لیے ایک بار پھر اپنی جانوں کے نذرانے پیش کرنے پڑے اور ملک پر آنچ نہیں آنے دی۔

جنگوں کے علاوہ آئے دن مارشل لاء اور غیر جمہوری حکومتی نظام میں غریبوں پر بہت ظلم ڈھائے جاتے رہے غریبوں کا لہو شاہراہوں پر بہتا رہا اور مزدوروں کا گوشت بازاروں میں بکتا رہا۔ فیضؔ وطن سے محبت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وطن ہمارا محبوب ہے اور محبوب کی خاطر ہم نے بے شمار قربانیاں دیں۔ فیض یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ آخر کب تک ہمیں اتنی قربانیاں دینا پڑیں گی۔ وہ اپنے محبوب وطن سے شکوہ کرتے ہیں کہ ہم تو محبت میں مجبور ہیں اور اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر رہے ہیں تو ہی بتا کہ آخر تجھے کتنا لہو اور چاہیے۔

تجھ کو کتنوں کا لہو چاہیے اے ارضِ وطن
جو ترے عارضِ بے رنگ کو گلنار کریں
کتنی آہوں سے کلیجہ ترا ٹھنڈا ہوگا
کتنے آنسو ترے صحراؤں کو گلزار کریں گے (۱۳)

عوام پر اتنے ظلم و جبر کیے گئے کہ ہر فرد کی آنکھ میں آنسو ہیں، ہر طرف غم ہی غم ہیں۔ ہر طرف سے آہوں اور سسکیوں کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ اے ارضِ وطن تیرے لیے ہزاروں لوگوں نے اپنی جانیں قربان کیں لیکن ملک کے حالات ویسے کے ویسے ہی ہیں، امن پھر بھی کہیں نظر نہیں آتا۔

تیرے ایوانوں میں پُرزے ہوئے پیماں کتنے
کتنے وعدے جو نہ آسودۂ اقرار ہوئے
کتنی آنکھوں کو نظر کھا گئی بدخواہوں کی
خواب کتنے تری شہ راہوں میں سنگسار ہوئے (۱۴)

اے میرے محبوب وطن جب ہم نے تجھے حاصل کرنے کے لیے کوششیں شروع کی تھیں تو ہمیں یقین تھا کہ تیرے حصول کے بعد مسلمانوں پر آئے دن کی مصیبتیں ختم ہو جائیں گی۔ امن و سلامتی کا بول بالا ہوگا، ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں ہوں گی۔ ہم نے امن و سلامتی اور انسانیت کے بول بالے کی امیدیں لگا کر تیرے حصول کے لیے بے شمار قربانیاں دیں لیکن ہماری یہ امیدیں پوری نہ ہو سکیں۔ اے ارضِ وطن پھر بھی ہم تیرے عاشق ہیں، تیرے لیے قربان ہوتے رہیں گے اور مرتے رہیں گے۔

ہم تو مجبورِ وفا ہیں مگر اے جانِ جہاں
اپنے عشاق سے ایسے بھی کوئی کرتا ہے
تیری محفل کو خدا رکھے اَبد تک قائم
ہم تو مہماں ہیں گھڑی بھر کے، ہمارا کیا ہے (۱۵)

فیضؔ کے کلام میں جنگ سے شدید نفرت کا اظہار ملتا ہے۔ کیونکہ جنگ پورے پورے خاندانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیتی ہے۔ لاکھوں بے گناہ شہریوں، معصوم بچوں اور عورتوں کو ہلاک کر دیتی ہے اور نہ جانے کتنی ہی ماؤں کے نوجوان بیٹوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ فیضؔ کی نظم ''سپاہی کا مرثیہ'' ایک ایسی ہی دکھوں کی ماری ہوئی ماں کے دل کی آہ ہے۔ اس کی اپنے بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کی خواہش حسرت بن کر رہ گئی ہے اور وہ بیٹا کفن پہنے اپنی قبر میں ابدی نیند سو رہا ہے۔ ماں اپنے بیٹے کی موت پہ بین کرتی ہے۔

اٹھو اب ماٹی سے اُٹھو
جاگو میرے لال
اب جاگو میرے لال
تُمری سیج سجاون کا رن
دیکھو آئی رین اندھیارن
نیلے شال دوشالے لے کر
جن میں اِن دُکھیں اَکھین نے
ڈھیر کیے ہیں اتنے موتی
اب جاگو میرے لال
گھر گھر بکھرا بُھور کا کندن
گھورا اندھیرا اپنا آنگن
جانے کب سے راہ تکے ہیں
بالی دُلہنیا ہاتھ کے ویرن
سُونا تمرا راج پڑا ہے

دیکھو کتنا کاج پڑا ہے (۱۶)

فیضؔ نہ صرف اپنے ملک میں قیام امن کے لیے کوشاں ہیں بلکہ پوری دنیا میں امن قائم کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔دنیا کے کسی بھی حصے پر اگر جنگ مسلط ہو تو فیض اُس کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔فیض جنگ و جدل اور خون ریزی کی سخت مخالفت کرتے ہوئے قیام امن کی خاطر آواز اٹھاتے ہیں۔فیض نے اُن ایرانی طلبہ کے خون کو اشرفیاں قرار دیا ہے جنھوں نے قیام امن کی جدوجہد میں اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے۔فیض اپنی نظم ''ایرانی طلبہ کے نام'' میں کہتے ہیں:

یہ کون سخی ہیں
جن کے لہو کی
اشرفیاں، چھن، چھن، چھن، چھن
دھرتی کے پیہم پیاسے
کشکول میں ڈھلتی جاتی ہیں
کشکول کو بھرتی جاتی ہیں (۱۷)

فیضؔ ارضِ عجم سے سوال کرتے ہیں کہ یہ کون سخی لوگ ہیں جن کی بھر پور جوانی کا کندن خاک میں ریزہ ریزہ بکھرا ہوا ہے۔آخر ایسی کون سی وجوہات تھیں جن کی وجہ سے اُنھوں نے اپنی جانیں قربان کر دیں۔

یہ کون جواں ہیں ارضِ عجم
یہ لکھ لُٹ
جن کے جسموں کی
بھر پور جوانی کا کندن
یوں خاک میں ریزہ ریزہ ہے
یوں کوچہ کوچہ بکھرا ہے
اے ارضِ عجم، اے ارضِ عجم!
کیوں نوچ کے ہنس ہنس کے پھینک دیے
ان آنکھوں نے اپنے نیلم (۱۸)

ارضِ عجم جواب دیتی ہے کہ یہ ظلم و جبر کی رات میں روشنی کی کرن ہے اور ان کی قربانیاں ضائع نہیں جائیں گی بلکہ ان کی قربانیوں کے نتیجے میں صبح بغاوت کا آغاز ہوگا۔

ان جسموں کی چاندنی سوا
ان چہروں کے نیلم، مرجاں
جگ مگ، جگ مگ، رُخشاں، رُخشاں

جو دیکھنا چاہے پردیسی
پاس آئے دیکھے جی بھر کے
یہ زیست کی رانی کا جھومر
یہ امن کی دیوی کا کنگن!''(۱۹)

فیضؔ صاحب کو فلسطینی مجاہدوں سے بھی گہری محبت ہے جو اپنے سروں پر کفن باندھے دشمن کے مقابل صف آراء ہیں۔ فلسطین کئی صدیوں سے جنگ کی لپیٹ میں رہا ہے۔ فیض کے زمانے میں اسرائیل فلسطین پر گولہ باری کر رہا تھا اور لاکھوں بے گناہ شہریوں کا قتل عام کر رہا تھا اور فلسطینی مجاہد بھرپور طریقے سے اُن کا مقابلہ کر رہے تھے۔ فیض صاحب تین سال تک اُن مجاہدوں کے ہمراہ رہے۔ سبطِ حسن لکھتے ہیں:

''فیضؔ صاحب نے اُنہیں مجاہدوں سے محبت اور اخوت کا رشتہ جوڑا اور بیروت میں تین سال تک گولی گولوں کی بارش میں اُن کے رفیق رہے۔''(۲۰)

۱۹۶۷ء میں جب عرب اسرائیل کے درمیان جنگ کا آغاز ہوا تو فیض نے نہایت گھن گرج والے لہجے میں نظم ''سرِ وادیِ سینا'' لکھی۔

پھر بھی ورق فروزاں ہے سرِ وادیٔ سینا
پھر رنگ پر ہے شعلۂ رخسارِ حقیقت
پیغامِ اجل دعوتِ دیدارِ حقیقت
اے دیدۂ بینا
اب وقت ہے دیدار کا، دم ہے کہ نہیں ہے
اب قافلِ جاں چارہ گرِ کلفتِ غم ہے
گلزارِ ارم پرتوِ صحرائے عدم ہے(۲۱)

۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۱ء کے تین سال فیضؔ نے بیروت میں قیام کیا اور ان دنوں بیروت میدانِ جنگ بنا ہوا تھا۔ ہر طرف گولہ باری ہو رہی تھی، سڑکوں پر خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں، پورا شہر دن رات دھماکوں کی آوازوں سے گونج رہا تھا، اسرائیلی درندوں نے فلسطینی کیمپوں میں گھس کر عورتوں اور بچوں کا بھی قتل عام شروع کر دیا تھا، فلسطینیوں پر ظلم وستم کے پہاڑ ٹوٹتے دیکھ کر فیض صاحب بہت غمزدہ تھے اور وہ فلسطینی مجاہدوں سے بے حد متاثر بھی تھے جنہوں نے ارضِ وطن پر اپنی جانیں نثار کیں۔ فیضؔ نے اپنی نظموں کے ذریعے مجاہدینِ فلسطین کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

جس زمین پر بھی کھلا میرے لہو کا پرچم
لہلہاتا ہے وہاں ارضِ فلسطین کا عَلَم
تیرے اعدا نے کیا ایک فلسطیں برباد
میرے زخموں نے کیے کتنے فلسطیں آباد (۲۲)

فیضؔ ایک طرف تو فلسطین میں ظلم وستم دیکھ کر غمزدہ تھے دوسری طرف وطن عزیز پاکستان پر جو فوجی آمروں کے ہاتھوں جور وستم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے اُن کا بھی انھیں شدید غم تھا۔ سبطِ حسن رقمطراز ہیں:

> ''بیروت کے قیام کے دوران فیض صاحب کے جذبات بہت متلاطم رہے۔ ایک طرف مجاہدین فلسطین کی سرفروشیوں کے مناظر، دوسری طرف وطن کی یاد اور ابنائے وطن پر فوجی آمریت کے ہاتھوں جور وستم کے جو پہاڑ ٹوٹے اُن کا غم، تنہائی کا شدید احساس، عدم تحفظ اور بے یقینی۔''(۲۳)

فیضؔ فلسطین میں جنگ سے متاثرہ بچوں سے بھی نہایت ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ فیض اس جنگ میں تنہا رہ جانے والے بچے کے لیے 'فلسطینی بچے کے لیے لوری'' کے عنوان سے نظم لکھتے ہیں جس میں اُس بچے کے گہرے دکھ اور بے چارگی کا احساس پایا گیا ہے۔

مت رو بچے
رو رو کے ابھی
تیری امی کی آنکھ لگی ہے
مت رو بچے
کچھ ہی پہلے
تیرے ابا نے
اپنے غم سے رخصت لی ہے
مت رو بچے
تیرا بھائی
اپنے خواب کی تتلی پیچھے
دُور کہیں پردیس گیا ہے
مت رو بچے
تیری باجی کا
ڈولا پرائے دیس گیا ہے(۲۴)

فیضؔ کے کلام میں جہاں جنگ کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے مظلوم لوگوں کا دکھ درد نظر آتا ہے وہاں روشن صبح کی امید بھی دکھائی دیتی ہے۔ فیضؔ ان مظلوم اور محکوم قوموں کو روشن صبح کا نظارہ بھی دکھاتے ہیں اور امید ظاہر کرتے ہیں کہ اس ظلم وستم کی جنگ میں فتح ہماری ہی ہوگی۔ فیضؔ دنیا بھر کی مظلوم اور محکوم قوموں کی آواز کو یکجا کر کے ۱۹۸۳ء میں ''ایک ترانہ مجاہدینِ فلسطین کے لیے'' کے عنوان سے نظم لکھتے ہیں:

ہم جیتیں گے

حقا ہم اک دن جیتیں گے
بالآخر اک دن جیتیں گے
ہے جنت اپنے پاؤں تلے
اور سایہ رحمت سر پر ہے
پھر کیا ڈر ہے
ہم جیتیں گے
حقا ہم اک دن جیتیں گے
بالآخر اک دن جیتیں گے(۲۵)

ترقی پسند شعرا میں فیض کی انفرادیت کے جہاں دیگر پہلو ہیں وہاں اُن کے کلام میں جنگ سے گریز اور نفرت کا عنصر بھی موجود ہے۔فیض عالمی امن کے خواہاں تھے۔اس لیے جنگ کسی بھی خطے میں ہو فیض نے اُس کے خلاف آواز اٹھائی۔معروضی سطح پر جب ہم اُن کے کلام کو دیکھتے ہیں تو علاقائی طور پر بھارت اور پاکستان کے مابین مبارزت ہو یا بین الاقوامی طور پر عربوں اور اسرائیل کے درمیان تصادم، انہوں نے نہ صرف جنگ سے نفرت کا اظہار کیا بلکہ اس جنگ میں جارحیت کا کردار ادا کرنے والوں کی مذمت بھی کی اور جنگ سے متاثرہ قوم یا افراد کے حق میں مرتے دم تک لکھتے رہے۔

حوالہ جات:

۱۔ میر تقی میر، **کلیات میر**، مرتبہ: مولانا عبدالباری آسی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص ۳۲۱
۲۔ مرزا اسداللہ خاں غالب، ''**دیوان غالب**''، لاہور: گوہر پبلی کیشنز،۲۰۱۲ء، ص ۳۳۷
۳۔ عقیل احمد صدیقی، **جدید اردو نظم-نظریہ و عمل**، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۰ء،ص ۵۴
۴۔ فتح محمد ملک، **تعصبات**، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز،س ۱۹۹۱ء، ص ۲۵۷، ۲۵۸
۵۔ ایضاً، ص ۴۵۵، ۴۵۶
۶۔ ایضاً، ص ۴۵۶
۷۔ سبط حسن، **سخن در سخن**، کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۹ء، ص ۷۵
۸۔ فیض احمد فیض، **نسخہ ہائے وفا**، لاہور: مکتبہ کارواں، س ن، ص ۵۱۵
۹۔ صغریٰ صدف، ڈاکٹر، مضمون، فیض اور امن، بشمولہ **شاعر خوش نوا**۔فیض احمد فیض، مرتبہ: ڈاکٹر طاہر تونسوی، لاہور: نستعلیق مطبوعات، ۲۰۱۱ء، ص ۳۶۰

۱۰۔ سبطِ حسن، **سخن در سخن**، ص ۷۷

۱۱۔ نسخہ ہائے وفا، ص ۵۲۷

۱۲۔ قاسم یعقوب، **اردو شاعری پر جنگوں کے اثرات**، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۱ء، ص ۱۹۱

۱۳۔ **نسخہ ہائے وفا**، ص ۶۲۴

۱۴۔ ایضاً، ص ۶۲۴

۱۵۔ ایضاً، ص ۶۲۵

۱۶۔ ایضاً، ص ۴۰۶، ۴۰۷

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۵۵

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۵۵، ۱۵۶

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۵۷

۲۰۔ سبطِ حسن، **سخن در سخن**، ص ۹۵

۲۱۔ **نسخہ ہائے وفا**، ص ۴۲۱

۲۲۔ ایضاً، ص ۶۳۶

۲۳۔ سبطِ حسن، **سخن در سخن**، ص ۹۶، ۹۷

۲۴۔ **نسخہ ہائے وفا**، ص ۶۳۶، ۶۳۷

۲۵۔ ایضاً، ص ۶۸۳